باب3

کالج کا زمانہ

کالج، سادھو صاحب اور اُرمیلا

ہمارے سکول کالج کے زمانے میں نتائج کا اعلان ریڈیو کے ذریعہ رول نمبر پڑھ کر ہوا کرتا تھا۔ میرا رول نمبر بھی امتحان پاس کرنے والوں میں شامل تھا، جب ہمارے سکول میں دسویں جماعت کے رزلٹ کارڈز آ گئے تو میں نے یہ حاصل کر کے اپنے نانا جان سے کالج جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے میری خواہش کا احترام کیا اور مجھے خود لے کر بارہ مولہ گئے۔ میری خواہش تھی کہ میں دیگر دوستوں کے ساتھ سرینگر سری پرتاب کالج یا امر سنگھ کالج میں داخلہ لوں لیکن میرے نانا جان مرحوم اور دیگر رشتہ داروں کا خیال تھا کہ میں بارہ مولہ ڈگری کالج میں داخلہ لوں کیوں کہ وہاں میری خالہ رہا کرتی تھیں جن کے خاوند محکمہ مال میں نائب تحصیلدار تھے۔ ان کے بیٹے الطاف کے ساتھ مجھے بہت پیار تھا اور ہم سگے بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ ان لوگوں کو بھی میرے ساتھ جنون کی حد تک پیار تھا۔ الطاف کے علاوہ ان کی ایک بیٹی ممتاز بھی تھی جو آج کل مقبوضہ کشمیر میں ہی کسی سکول کی ہیڈ مسٹریس ہے' اور میرے برادر نسبتی مشتاق قریشی سے بیاہی ہے جب کہ الطاف انڈین اکنامکس سروس کے ممبر تھے جو وہاں سے استعفیٰ دے کر کینیڈا میں آباد ہو چکے ہیں۔

بارہ مولہ میں ان دنوں سینٹ جوزف کالج ہوا کرتا تھا جو بعد میں[48] گورنمنٹ ڈگری کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔ میرے رشتہ داروں اور بالخصوص نانا جان اور خالاؤں کی خواہش تھی کہ میں سائنس کلاسز (پری میڈیکل) میں داخلہ لوں تا کہ ڈاکٹر بن سکوں۔ کشمیر میں ڈاکٹریٹ کی طرف جانا جنون کی حد تک پسند کیا جاتا ہے۔ میرا داخلہ گیارہویں کلاس (جس کو وہاں PUC یعنی پری یونیورسٹی کورس کہا کرتے تھے) میں ہو گیا۔ دو تین دن کی کلاسز کے بعد مجھے کالج کے پرنسپل پنڈت شام لعل سادھو نے اپنے دفتر میں بلایا اور دو تین منٹ میرے ساتھ گفتگو کے بعد مجھے پوچھا کہ ''بیٹا تم نے سائنس مضامین کیوں لیے ہیں؟'' میں نے کہا، ڈاکٹر بننے کے لیے۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر تم میرے بیٹے ہوتے تو میں تمہیں اکنامکس اور پولیٹکل سائنس پڑھاتا، یہ بھی تو اس ملک کی ضرورت ہیں اور ان لوگوں کی بھی بہت مانگ ہے۔ میں نے سائنس نہیں پڑھی اور میں اس کالج کا پرنسپل ہوں۔

انہوں نے چپڑاسی کو بلا کر کہا کہ اُرملا کو بلا کر لاؤ۔ ارملا ان کی بیٹی تھی جو مجھے معلوم نہیں تھا۔ البتہ اس کالج کی سب سے حسین اور دراز قد لڑکی تھی جو فر فر انگریزی بولتی تھی۔ داخلے والے دن ہی میری اس کے ساتھ کالج کی سیڑھیوں پر تقریباً ٹکر ہو گئی تھی جو محض ایک اتفاق تھا کیوں کہ میں ایک دیہاتی ماحول سے گیا تھا۔ سیڑھیوں پر چپس پڑے تھے جس کی وجہ سے میں اپنا پاؤں نہیں سنبھال سکا اور اتفاقاً ارملا کو ٹکر لگ گئی۔ اس کو پرنسپل کے کمرے میں دیکھتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ پرنسپل صاحب نے مجھے کہا کہ یہ میری بیٹی ارملا ہے۔ فرسٹ کلاس فسٹ میٹرک ہے اور اس کالج میں آرٹس میں داخلہ لیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ انگلش لٹریچر یا اکنامکس میں ماہر مضمون بنے تم اس سے مشورہ کر لو مگر میں تمہارے لیے آرٹس پسند کرتا ہوں۔

ارملا سے ایک آدھ گھنٹہ گفتگو کے بعد میں نے بھی وہی مضامین رکھ لیے جو اس کے تھے سوائے ہندی کے۔ ہندی کے برعکس میں نے فارسی رکھی۔ اس زمانے سے میرے پاکستان ہجرت تک ہم گہرے دوست رہے۔ ارملا آج انڈونیشیا کی کسی یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر پڑھاتی ہے۔ میرے چند تعلیم یافتہ بزرگ رشتہ داروں نے اس واقعہ کو ایک پنڈت کی سازش سمجھا کہ ایک مسلمان لڑکا ڈاکٹر نہ بن سکے لیکن

میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ انہوں نے مناسب وقت پر میری صحیح رہنمائی کی۔ میں لیبارٹری، تھیٹر یا کلینک نہیں چلا سکتا تھا جس کے لیے ہمہ تن گوش ہونے کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ میں سیلانی تھا اور زیادہ وقت سیر و تفریح اور دوست یاروں میں گزارتا تھا۔ جب میں نے اس کالج سے بی اے پاس کیا تو اسی پرنسپل شام لعل سادھو نے میرے حق میں ***Provisional certificate*** جاری کرتے ہوئے یہ کمنٹس لکھے:

"A brillaint boy with leadership flairs"

فارسی کی کلاس اور پروفیسر بٹ

آرٹس مضامین لینے کے بعد میری سب سے پہلی کلاس فارسی کی تھی جس کے استاد عبدالغنی بٹ تھے۔ جواب حریت کانفرنس کے صف اوّل کے لیڈر ہیں۔ یہ اپنے زمانے میں انتہائی خوش پوش اور روشن خیال آدمی تھے۔ ہر سطح کے انسان کے دوست تھے۔ انگریزی، فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے۔ فارسی کی نظموں کا ترجمہ عمومی طور پر انگریزی میں کرتے تھے، پہلے ہی دن پہلی ہی کلاس میں جو پہلی بات انہوں نے مجھے کہی، وہ تھی Mind your business۔ اس وقت ہمارے کالج میں مخلوط تعلیم تھی اور فارسی کلاس میں غالباً نو لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ میری سیٹ پہلے ہی دن اتفاقاً ایک لڑکی کے پیچھے لگی ہوئی تھی جس کے دوپٹہ پر سیاہی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ساتھ والے کلاس فیلو غلام احمد گنائی، کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ پروفیسر صاحب نے غالباً اس پر یہ جملہ کسا تھا لیکن مجھے ہمت نہ ہوئی کہ میں ان سے پوچھوں کہ ماجرا کیا ہے؟ میں نے سوچا کہ اگر انہوں نے یہی کہا کہ تم اس لڑکی کو کیوں گھور رہے تھے تو بڑی سبکی ہو گی اس لیے خاموشی غنیمت جانی۔ اس کے بعد یہ ہمارے ٹیچر نہیں بلکہ دوست کے طور پر پورے چار سال اس کالج میں اسی کلاس اور انہی لوگوں کے ساتھ رہے۔ ہمارے کالج میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہر دل عزیز اور کالج کی ہر مشکل کو سلجھانے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ پرنسپل صاحب نے اپنی تقریباً ساری ذمہ داریاں انہی کے سر پر ڈالی ہوئی تھیں۔ ان جیسے شوخ مزاج انسان کی دوستی پروفیسر شوکت میر کے ساتھ تھی، جو انتہائی خشک اور تنک مزاج تھے اور کالج میں کیمسٹری پڑھاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد پتا چلا کہ

میر صاحب ہمارے ساتھ خشک مزاجی کا مظاہرہ کرتے تھے، وگرنہ وہ غنی صاحب سے زیادہ دلچسپ انسان تھے۔

پروفیسر سوز اور فہمیدہ

غنی صاحب کے علاوہ پروفیسر سیف الدین سوز جو ریاست میں کانگرس پارٹی کے صدر اور مرکزی وزیر بھی رہے ہیں۔ ہمارے اکنامکس کے استاد تھے۔ یہ بھی بہت خوش پوش روشن خیال، محنتی، ترقی پسند اور ان تھک انسان تھے۔ میں بارہ مولا کے محلہ خانپورہ میں ان کا محلہ دار بھی تھا جہاں جانباز صاحب کے نام سے ایک مشہور درگاہ بھی ہے۔ میرا ان کے گھر اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ان کی بیگم صاحبہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں اور بہت پیار سے پیش آتیں۔ ان کو ہم آپا ممتاز کہا کرتے تھے۔ ان کی چھوٹی بہن فہمیدہ میری کلاس فیلو تھی، جن سے میں احتراماً بہت پیار کرتا تھا۔ نا معلوم وہ میری قابلیت سے کیوں متاثر تھیں۔ حالاں کہ میں ایسا نہیں تھا میرے آج تک ان لوگوں سے تعلقات ہیں اور میرے ساتھ اسی طرح پیش آتے ہیں جس طرح آج سے چالیس سال قبل۔

رسل ورسائل کرناہ براستہ نستہ چھسنہ گلی

کشمیر میں سردیوں میں چھٹیاں ہوا کرتی تھیں جن کے دوران ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ برف ابتدائے دسمبر سے پڑنا شروع ہو جاتی اور راستے بند ہو جاتے تھے جس کی وجہ سے ہمیں 35-30 میل کا جان لیوا سفر گیارہ ہزار فٹ برف پوش پہاڑ 'نستہ چھسنہ گلی' عبور کر کے جانا پڑتا تھا جس کی سطح سمندر سے اونچائی گیارہ ہزار فٹ ہے۔ اس گلی کا ہندوستانی فوج نے ''سادھنا'' نام رکھا ہے۔ اس زمانے میں یہ تقریباً پانچ ماہ بند رہتی تھی لیکن آج کل برف کے موسم میں بھی کھلی رکھی جاتی ہے کیوں کہ اس علاقے میں ہندوستان کی تقریباً چار بریگیڈ فوج تعینات ہے جس کی یہ واحد گزرگاہ ہے۔

1947 سے قبل کرناہ کا صدر مقام ٹیٹوال ہوا کرتا تھا اور اس کے فوراً بعد کنڈی کرناہ کی مقامی سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے بعد اس علاقے کا صدر مقام ٹنگڈار ہے، جہاں سب ڈویژن لیول کے

تمام دفاتر ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر اسمبلی میں اس علاقے کا ممبر خواجہ محمد یونس مرحوم اس گاؤں سے تعلق رکھتا تھا۔ برصغیر اور بالخصوص پاکستان اور کشمیر کی بدقسمتی ہے کہ ریاستی سطح کے لیڈر بھی بلدیاتی سطح کی سوچ رکھتے ہیں اور جب کسی فیصلہ کن مقام پر براجمان ہوتے ہیں تو سوچ مقامی ہی رہتی ہے جو ان کو قومی لیڈر بننے کی بجائے بلدیاتی لیڈر بناتی ہے۔ اس علاقے کی ساری سیاسی، سرکاری اور کاروباری سرگرمیاں اس قصبے کے اردگرد گھومتی ہیں۔ ''نستہ چھمہ گلی'' کے پار وادی کی طرف کاروباری حیثیت کا حامل پہلا قصبہ چوکی بل کہلاتا ہے جو 1995 تک کرناہ اور کیرن کے علاقے کے لوگوں کی ساری کاروباری سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ کرناہ اور کیرن سے وادی کے مختلف حصوں میں جانے والے لوگ یہاں تک پیدل چل کر آتے تھے کیوں کہ سردیوں میں ان کے علاقے اور گلی برف باری کی وجہ سے مسدود ہو جاتے تھے۔ گرمیوں میں بھی مال برداری ٹرکوں کے علاوہ سواری کا کوئی اور بندوبست نہیں ہوا کرتا تھا۔ اکثر لوگ پیدل یا سامان سے لوڈڈ ٹرکوں' یا ملٹری ٹرکوں اور گاڑیوں کے ذریعے سفر کرتے تھے۔ برف باری کے موسم میں ٹنگڈار سے چوکی بل کا پورا راستہ Snow Sliding اور Land Sliding کی زد میں رہتا تھا جس سے بہت زیادہ جانی نقصان ہوا کرتا تھا چوں کہ یہ سارا راستہ دفاعی نقطہ نظر سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے فوج کے کنٹرول میں ہی رہتا ہے۔

فوج نے برف باری کے موسم میں رات گیارہ بجے سے دن گیارہ بجے تک اس راستہ پر پیدل سفر کی اجازت رکھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رات پڑتے ہی برف یخ بستہ ہو جاتی ہے جس سے Sliding نہیں ہوتی اور دن کو گرمی سے برف پگھل جاتی تھی جس سے برف اور زمینی کٹاؤ شروع ہو جاتا ہے جو جانی ضیاع کا باعث بنتا تھا۔ رات کے وقت بھی لوگوں کو گروپوں کی صورت میں سفر کرنا پڑتا تھا جو کم از کم دس افراد ہوتے تھے۔ فوج کی ہدایت کے مطابق قافلہ ایک رسہ پکڑے ہوئے چلتا تھا جس سے لوگ ہم قدم اور ایک دوسرے کا سہارا بنے رہتے تھے۔ فلموں یا ٹی وی پروگراموں میں برفانی مہمات کے جو مناظر دکھائے جاتے ہیں، ان میں یہی طریقہ کار دیکھنے میں آتا ہے۔ ٹنگڈار سے چوکی بل تک فوج کی چھے چوکیاں لگی رہتی تھیں جو کشمیری تحریک کے بعد درجنوں تک پہنچ گئی ہیں۔ ہر چوکی پر

قافلہ کی گنتی ہوتی تھی جس کی اطلاع اگلی چوکی کو دی جاتی تھی۔ چوکی پر عندالطلب[48] پانی وغیرہ بھی مہیا کیا جاتا تھا جو فوج کی جانب سے عوام کے ساتھ ایک تعاون ہوا کرتا تھا لیکن 1989 کی تحریک کے بعد یہ بداعتمادی کا شکار ہو گیا ہے۔ ایسے موسم میں سفر کرتے وقت گُڑ، مونگ پھلی یا بادام، کاجو (حسب توفیق)، سگریٹ اور تھرموس میں چائے کا خصوصی طور پر بندوبست رکھا جاتا تھا۔ صاحب ثروت لوگ روسٹ اور روغنی روٹیاں بھی زادِراہ کے طور ساتھ رکھتے تھے۔

موسم سرما میں برف پڑنے سے پہلے چھے ماہ کے لیے اس وادی میں ضرورت کی ہر چیز بالخصوص راشن اور ایندھن جمع کیا جاتا تھا۔ اگر کسی چیز کی بالخصوص راشن، مٹی کا تیل یا ادویات وغیرہ کی کمی پڑ جائے تو چوکی بل سے مزدور لے کر آتے تھے جس کے لیے اس زمانے میں فی کلو دس روپے اجرت دی جاتی تھی۔ ادویات اور زندگی کی چند دیگر ناگزیر چیزیں فوج کو بھی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ پہنچائی جاتی تھیں۔ سال 1993 کے بعد مجھے بتایا گیا کہ فوج نے ہیلی کاپٹر سروس بھی شروع کر رکھی ہے جو لوگوں کو ٹنگڈار سے کپواڑہ تک مفت لے جاتی ہے۔ لیکن اب باضابطہ بالمعاوضہ سروس چلائی جا رہی ہے۔ عالمی موسمی حالات بدل گئے ہیں اس لیے اب برف باری پہلے جیسی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ راستہ اب چند دن ہی بند رہتا ہے اور تحریک مزاحمت کی وجہ سے بھی راستہ کھلا رکھنا فوج کی مجبوری ہو گئی ہے۔ اس لیے یہ علاقہ اب اس طور بند نہیں رہتا۔ فوج کی کانوائے بھی لوگوں کو سواری مہیا کرتی تھی جس کے لیے ایم پی چیک پوسٹ پر مسافر کا نام پتہ درج کر کے گاڑی میں سوار کیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ میرے خیال میں لوگوں کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھنے کے لیے فوج کو خصوصی طور پر اس سیاسی حکمت عملی کی ہدایت کی گئی ہے۔

موت کا رقص

میں سرمائی چھٹیوں اور اس کے دوران (سادھنا) نستہ چھسنہ گلی کے سفر اور برف باری سے مسدود ہونے کا ذکر کر رہا تھا کہ وادی کرناہ سے متعلقہ چند واقعات یاد آ گئے جن کا درج کرنا ضروری

محسوس کرتا ہوں۔

یہ راستہ موسم سرما میں اکثر مسدود رہتا اور بعض اوقات مسافروں کے سفر کو موت کا سفر بنا دیتا تھا۔ ایسے میں اس رستے پر سفر کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ سال 1965 کا واقعہ ہے کہ میں اپنے چند کلاس فیلوز اور باقی گاؤں والوں کے ساتھ فروری کے آخری ہفتہ میں کالج کی چھٹیوں کے اختتام کے قریب قریب کرناہ سے چوکی بل کی طرف عازم سفر ہوا۔ گھر سے حسب دستور رات کے نو بجے کے قریب نکلے جس وقت موسم بالکل صاف تھا۔ ہم سادھنا گلی کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ قافلہ بہت بڑا تھا۔ برف بھی بہت زیادہ تھی اس لیے ہر قدم برف میں ڈوب جاتا تھا اور بمشکل دس منٹ چل کر سانس پھول جاتا تھا۔ برف پر چلنے کے لیے عمومی طور پر خشک دھان کی رسی کی بنی ہوئی چپل جس کو مقامی زبان میں ''پول'' کہتے ہیں، پہنی جاتی تھی کیوں کہ یہ برف میں پھسلتی نہیں تھی۔ جو لوگ برفانی جوتے پہنا کرتے تھے، وہ بھی عمومی طور اس پر یہ رسی پھیر دیا کرتے تھے۔

ہم لوگ چڑھائی میں کشاں کشاں قدم بڑھا ہی رہے تھے کہ موسم خراب ہو گیا۔ دھند چھا گئی اور برف باری شروع ہو گئی۔ سادھنا گلی کی گزرگاہ تو بظاہر ایک آدھ کلومیٹر ہی رہ گئی تھی لیکن اس قدر شدید برف باری شروع ہو گئی کہ قدم ہی نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ گلی کے ٹاپ پر پہنچنے میں ہم کو تقریباً پانچ گھنٹے لگ گئے اور اسی دوران صبح ہونے لگی۔ فوج نے ہمیں گلی کے ٹاپ پر روک لیا اور جب صبح خوب روشن ہو گئی تو سفر کی اجازت دی البتہ ہمارے ساتھ سفر کرنے والے فوجیوں کو سفر کی اجازت نہیں ملی۔ ہم لوگ عازمِ سفر ہو گئے، تب تک برف باری بھی رک گئی تھی۔ یہاں سے آگے ڈھلان تھی لیکن برف چوں کہ تازہ پڑی تھی اور ہم نے ''کھرا'' نکالنا تھا یعنی نیا راستہ بنانا تھا، اس لیے طے ہوا کہ قافلے میں شامل 22 یا 23 لوگوں میں سے ہر ایک دس دس منٹ کے لیے باری باری کھرا نکالے گا تا کہ کسی ایک پر بوجھ نہ پڑے۔

اب دھوپ بھی نکل چکی تھی اور سورج اپنی کرنیں پھیلائے ہوئے تھا۔ لیکن دھند نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دوپہر کے دو بجے کا وقت تھا کہ برف کی sliding ہونا شروع ہو گئی۔ برف کی بڑی slide کو مقامی زبان میں ''لانڑیں'' اور چھوٹی کو ''چھرہ'' کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ موت کا رقص

پیش کرتے ہیں۔ قدم قدم کے بعد چھرے چلنے شروع ہو گئے جس سے کھرا نکالنا اور بھی دشوار ہو گیا۔ میں اور میرے ساتھ دو تین ساتھی کئی بار چھروں کی زد میں آئے لیکن الحمدللہ اس میں دبنے سے بچ گئے ایک جگہ دب بھی گئے لیکن یہ چھرہ ہم کو بہا نہ سکا۔ ہمارے ساتھیوں نے ہمیں اس مشکل سے خلاصی دلائی اسی دوران بہت بڑی ''لانڑی'' آئی اور قافلے کے درمیان میں سے چھے آدمیوں کو ناپید کر دیا۔ پیچھے والوں کے لیے راستہ نہ رہا اور آگے والے بہت آگے نکل گئے۔ میں قافلے کے اگلے حصہ میں تھا۔ بہہ جانے والوں میں سے دو میرے کلاس فیلو تھے۔ ایک کا نام عزیز اور دوسرا مجید تھا۔ مجید نہ معلوم کس طرح موت کو چکمہ دے کر اس روز شام تک ایک کھائی سے نکل آیا لیکن عزیز اور اس کے ساتھ چار دیگر لوگوں کی گلی سڑی اور ناقابل شناخت لاشیں جون کے مہینے میں ملیں۔ اس جان لیوا سفر میں ہم لوگ جب بھی سفر پر نکلتے تھے تو یقیناً گھر والوں اور دوستوں رشتہ داروں سے بخشوا کر نکلتے تھے۔

ایسے کئی اور حادثات بھی ہوئے جو سب یاد نہیں لیکن دو جان لیوا حادثات کا ہی ذکر کرتا ہوں۔ جب میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ ماموں کے ساتھ جنگل میں مکان کے لیے درخت کاٹ کر اس کی شہتیر بنانے کے بعد جب ماموں نے ایک شہتیر ڈھلان کی طرف لڑھکایا کہ سڑک کے قریب جائے۔ ان کو خیال ہی نہیں رہا کہ نیچے کی طرف میں ہوں۔ وہ شہتیر میرے اوپر سے موت کا پروانہ بن کر گزرا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ مجھے میرے مالک نے یوں محفوظ رکھا جیسے وہ اپنے بندوں کو رکھتا ہے۔ یہ اللہ کی شان ہے۔

دوسری بار 2012 کے رمضان کی ستائیسویں رات میں اپنی دونوں بیٹیوں بچوں سمیت اسلام آباد سے مظفر آباد آ رہا تھا کہ میری لینڈ کروزر گاڑی کی بریک فیل ہو گئی۔ میں اس وقت گاڑی خود چلا رہا تھا۔ سڑک کی دائیں جانب ڈھلان پہاڑ جس کے نیچے دریائے جہلم اور بائیں جانب اونچا پہاڑ تھا جبکہ سامنے موڑ اور پل تھا۔ میں نے سلامتی اسی میں جانی کہ بائیں جانب پہاڑ سے ٹکراؤں جس میں بچنے کی امید تھی۔ چنانچہ میں نے یہی کیا لیکن گاڑی الٹ گئی اور ہم سب اس میں پھنس گئے۔ یہ سارا واقعہ سڑک کے درمیان ہوا۔ میرے گن مین نعیم نے سامنے والے شیشے کو لات مار کر توڑا اور لوگوں نے

ہمیں وہاں سے نکالا۔ ہم سب لوگ معجزاتی طور پر بچ گئے۔ تاہم ایک نواسے کا بازو فریکچر ہو گیا۔ یہ واقعہ آج بھی موت کے منظر کے طور یاد آتا ہے۔ بہ قول شیخ ظہورالدین حاتم:

؎ فی الحقیقت کوئی نہیں مرتا
موت حکمت کا ایک پردہ ہے

ٹیٹوال کا کتا

وادی کرناہ پہاڑوں کے اندر گھرا ہوا علاقہ ہے اس کے اطراف میں سوائے نستہ چھنہ گلی (سادھنا) کے گزرگاہ کے باقی سارے قدرتی راستے آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد کے مختلف علاقوں میں کھلتے ہیں۔ مال مویشی اور ناواقف لوگ اکثر اِدھر اُدھر بھٹک جایا کرتے تھے۔ 1971 تک تو سرحدی گاؤں کے لوگ روزمرہ کی اشیاء ضروریہ جس طرف سے وافر اور سستی ملتیں خرید لیا کرتے تھے۔ اس وادی میں اخروٹ بہت پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی گریاں عمومی طور پر سمگل ہو کر براستہ آزاد کشمیر پاکستان بھیجی جاتی تھیں جو معقول آمدن کا ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔ 1971 تک تو اس وادی کا ایک سرحدی گاؤں جس کا نام سدھپورہ ہے، کے ایک مکان کے دو حصے تھے جس میں سے آدھا ہندوستانی علاقے میں تھا جبکہ دوسرا آزاد کشمیر میں لیکن 1971 کی جنگ کے بعد یہ سارا گھر آزاد کشمیر کی حدود میں آ گیا۔ سرحد کے دونوں جانب لوگوں کو مشکوک سمجھا جاتا ہے اور یہ بات اب بھی ہے۔ یہاں کے لوگوں کی صحیح تصویر کشی سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانے ''ٹیٹوال کا کتا'' میں کی ہے جس میں ہندوستانی اور پاکستانی چوکیوں کے درمیان محصور اور بھٹکنے والے کتے کو دونوں اطراف کے ذمہ داران جاسوس سمجھ کر زیرِ عتاب لاتے جو بال آخر دونوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ حالاں کہ یہ کتا رزق اور پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں غلام محمد صادق مرحوم کی حکومت کے دوران سرحدی علاقوں بالخصوص ہمارے علاقے کے لوگوں کو راحت ملی فوج اور اس کی ایجنسیوں نے اپنا ہاتھ کھینچا، وگرنہ ہر روز یوم حساب ہوا کرتا تھا۔ ہندوستانی عدالتیں آزاد ہونے کی وجہ سے فوج عدالتی معاملات سے ہمیشہ خائف

رہتی تھی کیوں کہ Habeus corpus کی رٹ عمومی طور فوج کے خلاف ہی جاری کی جاتی تھی۔ مقامی سطح پر دفعہ 100 ض ف کے تحت بھی مجسٹریٹ فوجیوں اور ایجنسیوں سے نظر بند کیے جانے والے لوگوں کو برآمد کراتے تھے۔ لیکن اب ہندوستانی عدالتوں کا کشمیریوں کے خلاف انصاف کا معیار بدل گیا ہے جہاں ثبوت کی بنا پر نہیں بلکہ ''قوم کے مجموعی ضمیر کے اطمینان''

To satisfy the collective conscience of the Nation کے لیے پھانسی کی سزا بھی دی جاتی ہے جس طرح محمد افضل گورو کو دی گئی۔

ٹیلر ماسٹر صفدر

اس محصور وادی میں 1962 سے 1965 تک ایک عجیب قسم کی حساس کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ علاقے کے مختلف حصوں بالخصوص سڑکوں اور فوجی گزرگاہوں پر مائن نصب کیے جاتے تھے جس کی وجہ سے فوج کو شدید نقصان ہوا کرتا تھا۔ اس وجہ سے پورے علاقے میں ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی اور ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مار پیٹ اور پکڑ دھکڑ عروج پر تھی۔ انتظامیہ اور فوج نے مل کر ٹھیکری پہرہ کا اہتمام کیا لیکن اس کے باوجود بھی اس میں کمی نہیں آئی۔ حالاں کہ رات کو کرفیو بھی لگایا جاتا تھا۔ اس ٹھیکری پہرے کا سربراہ ماسٹر صفدر کو مقرر کیا گیا۔ ایک دن غلام رسول نامی ایک شخص سدھپورہ گاؤں سے پکڑا گیا جو آزاد کشمیر کا باشندہ تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ ٹھیکری پہرے دینے والوں کا انچارج ماسٹر صفدر علی ساکن کنڈی جو پیشے کے لحاظ سے درزی تھا' مائنز نصب کرتا تھا۔ فوج کو اس غلام رسول سے پتا چلا کہ کس روز صفدر علی نے کہاں کہاں مائن نصب کرنے ہیں۔ رات فوج نے اس کے مکان کو خفیہ طور پر گھیرے میں لے لیا اور جب وہ مائن لے کر نکلا اور نصب کرنے ہی والا تھا تو اس کو موقع پر پکڑ لیا اسی روز غلام رسول بھی سدھپورہ اور کنڈی کے درمیان ایک پہاڑ ''رتی ڈھیری'' میں مبینہ طور پر مقابلے میں مارا گیا۔ صفدر علی خان کو ہتھکڑیاں ڈالے آنکھوں پر پٹی باندھے خانہ تلاشی کے لیے اس کے گھر لے آئے جو ہمارے سکول کے ساتھ ہی تھا۔ اس کے ساتھ پولیس اور سادہ کپڑوں میں ملبوس فوج کے لوگوں کا ایک جلوس تھا۔ ساتھ

ہی علاقے کے چند معتبر لوگ بھی تھے جنہوں نے یہ تلاشی witness کرنی تھی۔ مبینہ طور پر اس کے گھر سے مائنز کی کئی پیٹیاں اور کچھ نقشے وغیرہ برآمد ہوئے جن میں ان مقامات کی تفصیل تھی جہاں جہاں مائن نصب کیے جانے تھے۔ ہم لوگ گو کہ اس سے بہت ہی ہیبت زدہ ہو گئے لیکن حوصلے اس لحاظ سے بلند بھی ہوئے کہ شیر کے منہ میں رہ کر یہ شخص کس جواں مردی سے یہ کام کرتا تھا۔ اس شخص کے خلاف مقدمہ چلا اور تقریباً دس سال کے بعد میں نے اس کو دوبارہ اسی دکان میں درزی کا کام کرتے دیکھا جہاں یہ پہلے کام کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا سب سے اعلیٰ کاری گر تھا۔

مجھے ایک بات آج تک سمجھ نہیں آئی کہ غلام رسول نامی جو شخص اس کو یہ مائنز سپلائی کرتا تھا، اس روز کیوں مارا گیا جس روز اس کو بھی گرفتار کیا گیا۔ حالاں کہ اس کے خلاف یہ بہترین گواہ تھا اور اس سے قبل ہی فوج کی تحویل میں بھی تھا۔ 1976 میں جب میں آزاد کشمیر کے لیے معہ اپنی فیملی کے آنے والا تھا، ماسٹر صفدر نے مجھے کسی صوبیدار کا نام بتایا جو اس کے بقول 'میاں والی کا رہنے والا تھا جس نے اس کو اس کام کے لیے مقرر کیا تھا اس نے کہا کہ'' پاکستان کے ذمہ داروں سے کہیں کہ اگر کسی سے کام لیتے ہیں تو مشکل میں اس کا خیال بھی رکھا کریں اور جن کے ذریعہ کام کرواتے ہیں ان پر بھی نظر رکھا کریں۔'' اور ساتھ کہا کہ'' اس صوبیدار کا نام بھی کسی ذمہ دار کو بتائیں کہ اس پر نظر رکھیں۔'' مجھے صوبیدار کا نام یاد رہا اور نہ ہی میں ایسا کہنے کا رسک لے سکتا تھا کیوں کہ مقبوضہ کشمیر سے آنے والوں کو عمومی طور پر مشکوک سمجھا جاتا ہے جو بہت بڑا المیہ ہے' لیکن یہ بات آج تک میرے ذہن میں گونج رہی ہے کہ صفدر جیسے بہادر اور منصوبہ ساز لوگ ہم میں موجود رہے ہیں یا ہیں؟ اس کے باوجود ہم دشمن پر غالب کیوں نہیں آئے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ بقول صفدر جن کے ذریعہ کام کرواتے ہیں ان پر بھی نظر رکھا کریں اور ہم ایسا کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں؟

این سی سی اور کرنل ہرنام سنگھ

1965 کا سال میری زندگی کا انتہائی ابتلاء کا سال تھا اس سال کی ابتدا ہی موت کی وادیوں

کی گزرگاہوں سے ہوئی۔ خود ڈوبا، دوست اور کلاس فیلوز غرق ہو گئے۔ چالیس[48] میل کا سفر تین دنوں میں پیدل طے کیا۔ اس سال کالج میں میری پہلی کلاس کا امتحان تھا جس کو PUC یعنی *Pre University Course* کہتے تھے۔ امتحان کا نتیجہ آنے کے بعد اگلی کلاس TDC یعنی *Three Years Degree Course* کے پہلے سال میں داخلہ ہوا۔ اس سال سے NCC کرنا ضروری تھا۔ ہفتے میں صرف دو کلاسز ہوا کرتی تھیں۔ پہلی سات آٹھ کلاسز میں تو صرف ڈرل (PT) وغیرہ سکھاتے تھے البتہ اس کے بعد 303 بندوق کے کھولنے اور اس سے فائر کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ ہمارے کالج کی NCC کا انچارج کمانڈنٹ ایک سکھ کرنل ہرنام سنگھ تھا جبکہ ایک صوبیدار اور ایک حوالدار کشمیر سے تعلق رکھنے والے پٹھان تھے۔

ہندوستانی منصوبہ ساز بھی بلا کی سوچ رکھتے ہیں۔ سکھوں اور پٹھانوں کی Combination کمال کی کی گئی تھی۔ دونوں تلخ، زود رنج اور سخت گیر تھے۔ کالج میں پہاڑی اور بارڈر علاقوں سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کے لیے فوج یا رائفل کوئی نئی چیز نہ تھی۔ البتہ وادی کے لڑکوں کے لیے یہ سب باتیں نئی تھیں کیوں کہ وادی کے اندر فوج کی نقل و حرکت نہیں ہوا کرتی تھی اور نہ ہی بندوقیں ہر کس و ناکس نے دیکھیں یا استعمال کی تھیں۔ میرے لیے اس کو ہینڈل کرنا آسان تھا کیوں کہ میں اپنے علاقے کا ایک اچھا شکاری بھی تھا۔ ایک روز فائرنگ گھاٹ پر جب ہمیں لایا گیا تو ہر ایک کو پانچ پانچ راؤنڈ گولیاں نشانہ لگانے کے لیے دی گئیں۔ میری اور اوڑی کے لڑکوں کی سب گولیاں نشانے پر لگیں۔ البتہ وادی کے لڑکوں نے کرنل صاحب سے بے عزتی کروانے کے بعد ہی گولیاں چلائیں، نشانہ لگنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کرنل صاحب نے ہم سب کو مخاطب کر کے کہا کہ'' بندوق تو ہم نے آپ کو چلانا سکھا دی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ ہم پر ہی چلے گی۔'' مسلمان صوبیدار اور حوالدار کہتے تھے،'' سیکھو سیکھو کبھی کام آئے گا۔'' دونوں کی یہ بات فی الواقع 24 سال کے بعد سچ ثابت ہوئی جب ہماری نئی نسل کے لوگوں نے 1989 کے بعد ہندوستانی فوج پر ہی بندوقیں تان لیں اور دل سے خوف ایسا نکل گیا کہ جیسے سب لوگ مادر پدر شکاری اور رستم ہوں۔ اور صورت حال کچھ یوں ہو گئی، بہ قول محمد علوی:

؎ دو نالی بندوق چلاؤں
جنگل میں کہرام لکھوں

بڈگام کیمپ اور آپریشن جبرالٹر

سال 1965 میں ہی پاکستان کی جانب سے مقبوضہ کشمیر میں ''آپریشن جبرالٹر'' نامی ناکام مہم کا آغاز ہوا اس سال اگست کے پہلے ہفتہ میں ریاست بھر کے کالجوں کے NCC کے دوسرے سال کے *Trainees* کا کیمپ بڈگام میں لگا تھا۔ میں اپنے کالج میں NCC کلاس کا *Under Officer* تھا، اس لیے میری ذمہ داریاں باقی لوگوں کی نسبت زیادہ تھیں۔ مجھے کیمپ میں اپنے جوانوں کی دیکھ بھال کے علاوہ سرینگر سے فوجی ٹرک میں راشن بھی لانا ہوتا تھا۔ میرے ساتھ قریبی دوست عبدالمجید وٹالی اور دیگر دو لوگ بھی راشن وغیرہ لانے کے لیے سرینگر جاتے تھے جو وہاں سے بمشکل 12/15 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

میرے خیال میں 6 اگست 1965 کا واقعہ ہے ہم لوگ سرینگر میں سبزی خرید رہے تھے کہ سبزی والا کسی دوسرے آدمی سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ ہمارے کانوں میں صرف اتنی ہی آواز پڑی کہ پاکستانی مجاہد گلمرگ اور ٹنگمرگ میں ہیں۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا لیکن وہ بات کو ٹال گیا۔ بعد کی تحقیقات سے پتا چلا کہ ان لوگوں نے 9 اگست کو ان جلسے جلوسوں میں شامل ہو کر عسکری کارروائی کرنی تھی اس دن کو شیخ محمد عبداللہ کی 1953 میں برطرفی کے خلاف یوم سیاہ کے طور منایا جاتا ہے۔

مجید وٹالی کا بڑا بھائی علی محمد ان دنوں سرینگر میں DSP انچارج سٹی تھا جو کہ بڑا ذہین، محنتی اور اثر ورسوخ رکھنے والا آفیسر تھا اور فیملی کے سمیت جواہر نگر میں رہتا تھا۔ اب بطور DIG ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے۔ مجید ان لوگوں کو ملنے گیا اور واپسی پر بتایا کہ پاکستانی لوگ سرینگر کی طرف رواں ہیں اور غالباً ایک دو روز میں سرینگر پہنچ جائیں گے۔ یہ سن کر ہم لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ پاکستانی وادی کے اندر داخل ہو گئے ہیں اور ہم لوگ بھی کیمپ میں لنگر انداز ہیں۔ یونہی میرے ذہن میں فوجی کرنل کی بات گونجنے لگی کہ ''آپ کی بندوقیں ہم پر ہی چلیں گی۔'' میں نے سوچا کہ اب بندوق چلانے کا وقت آ

گیا ہے۔ لہٰذا باقی ہم خیال دوستوں کو بھی اس راز سے آشنا کیا۔ بڈگام کیمپ[48] میں شام گئے تک یہ خبر گردش کرنے لگی اور تقریباً ہر شخص کو علم تھا لیکن کوئی Share نہیں کرتا تھا جیسا کہ اسی کو معلوم ہے اور باقی سب بے خبر ہیں۔ ہماری ٹریننگ پر مامور فوج چوکنا تھی۔ رات تقریباً ایک بجے کا وقت تھا کہ فائرنگ کی آواز آئی جو مختلف اطراف سے ہو رہی تھی ہم سب لوگ بوٹ وغیرہ پہن کر بیٹھ گئے۔ اب بات زبان زدِ عام ہو گئی اور ہم لوگ برملا پاکستانیوں کا ساتھ دینے پر تل گئے۔ کیمپ انچارج کرنل کو اس بات کی بھنک مل گئی جس نے کیمپ کو بند کرنے کا حکم دے دیا اور دن کے تقریباً گیارہ بجے ہمیں بسوں پر سوار کر کے بارہ مولہ کالج کی طرف روانہ کر دیا۔ رات گئے۔ کسی نے ہمیں یہ خبر سنائی کہ پاکستانی بڈگام میں بھی پہنچ گئے ہیں اور اس کیمپ پر حملہ کرنے والے تھے لیکن ان کو مخبر نے خبر دی کہ یہ کالج کے لڑکے ہیں جس بنا پر انہوں نے محض فائرنگ کر کے دھمکی دی کہ کیمپ خالی کر دیں جس وجہ سے کیمپ خالی ہو گیا۔

ٹریننگ دینے والے لوگوں کو یہ شک گزرا کہ کہیں ہم لوگ بھی ان مجاہدین کے ساتھ شامل نہ ہو جائیں جن کو ہندوستانی دراندار کہہ رہے تھے۔ ہم لوگوں نے رات بارہ مولہ تھانے میں گزاری۔ اگلے روز رسمی کارروائی کے بعد ہمیں اپنے اپنے گھروں کو جانے دیا گیا۔ ماحول میں ایک عجیب قسم کا تناؤ اور کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ عام کشمیری مسلمان یہ سن کر پھولے نہیں سماتا تھا کہ پاکستانی گلمرگ سے نکل کر براستہ سرینگر بڈگام اور جموں صوبہ کے پونچھ، مینڈر، راجوری، ڈوڈہ اور بھدرواہ میں پہنچ گئے۔ میں نے اکثر ذمہ دار اکابرین سے سنا کہ یہ واردات کسی مقامی لیڈر کو اعتماد میں لیے بغیر کی گئی تھی۔ اس زمانے میں میرے تعلقات وادی میں زیادہ نہیں تھے محض اپنے کلاس فیلوز، دوستوں یا ان کے گھر والوں کے ساتھ رسم وراہ تھی۔ چوں کہ میں ایک پہاڑی علاقے سے باقاعدہ رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے پہلی بار وادی کے قصبے بارہ مولہ گیا تھا۔ اس لیے وہاں کے اس لیول کے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور بود و باش اختیار کرنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن باقی لوگوں کے مقابلے میں میرے لیے اس لیے آسان ہو گیا کہ میرے عزیز و اقارب وادی کے مختلف حصوں میں رہتے تھے جو بااثر اور پڑھے لکھے تھے۔ میں کشمیری زبان جانتا تھا اس لیے جب بھی کسی طالبعلم یا اس کے گھر والوں

سے ملتا تو جلد ہی مانوس ہو جاتا اور ہر کوئی مجھے اپنا سمجھنے لگتا۔ ہم زبان ہونا باہمی مضبوط رشتہ قائم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ اور Equation ہوتی ہے۔

اس اختلاط کی وجہ سے میری ان ہم جماعتوں کے گھر تک رسائی ہوگئی جو کشمیر کی سیاست اور معاشرت میں اثر رکھتے تھے۔ ان اہم شخصیات میں بارہ مولہ میں خانپورہ کا شاہ خاندان جن کی اس وقت کی نمایاں شخصیت مبارک شاہ جو سوڈان میں ہندوستانی سفیر اور کشمیر کی حکومت میں وزیر رہنے کے علاوہ مرکزی حکومت میں بھی وزیر رہ چکے ہیں۔ پروفیسر سیف الدین سوز جو ہندوستان کے ماہر اکانومسٹ اور مرکزی وزیر، پیر ولی شاہ صاحب جو بارہ مولہ کے ممتاز خطیب اور روحانی پیشوا ہونے کی حیثیت سے اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ میری اپنی ننھیال سے پیر نجم الدین صاحب کشمیر کے سیاسی، سماجی اور ادبی حلقوں میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ میرے خاندان کے لوگ اور قریبی رشتہ دار ٹیٹوال کے گیلانی سادات جو ریاست کی سول سروس میں اعلیٰ عہدوں یعنی سیکریٹری حکومت، پولیس، میڈیکل اور جوڈیشل سروس میں تھے۔

ان لوگوں کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے اس ماحول کی آپریشن جبرالٹر کے حوالے سے جو باتیں اس زمانے میں کی جاتی تھیں وہ اب میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔ ان لوگوں کی گفتگو سے محسوس ہوا کہ آپریشن شروع کرنے سے قبل کشمیری قیادت کو اعتماد میں نہیں لیا گیا یا اس قابل نہیں سمجھا گیا تھا۔ آپریشن موئے مقدس کی تحریک کے زعم میں شروع کیا گیا تھا کہ عوام ہندوستان کے خلاف ہیں۔ یہ تو سچ ہے لیکن اس مذہبی تحریک اور ہندوستان کے خلاف تحریک میں غیر معمولی فرق تھا۔ مجاہدین جموں کے مسلمان علاقوں کے علاوہ وادی کے تقریباً ہر علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ علاقے کے لوگوں کے لیے یہ بات گو کہ خوش آئند تھی لیکن حیران کن بھی تھی کیوں کہ کسی بھی مقامی سیاسی لیڈر کو اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی جو لوگوں کو ان کی مدد کے لیے منظم کرتا۔ سول سوسائٹی کی تائید اور حمایت کے بغیر کوئی بھی فوج فتح کے ثمرات حاصل نہیں کر سکتی اور بالآخر جیتی ہوئی جنگ ہار جاتی ہے۔ اس زمانے میں ہندوستانی فوج کی گرفت اتنی مضبوط نہیں تھی۔ میرے خیال میں لوگوں کو سرپرائز دے کر آزاد کروانے

کے چکر میں یہ آپریشن ناکام ہوگیا اور بالآخر ہند اور پاکستان کی جنگ پر منتج ہونے کے علاوہ پاکستان اور کشمیریوں کے لیے نقصان کا باعث بنا۔

پاکستان نے ان ''دراندازوں'' ''مجاہدین'' کو واپس بلا لیا لیکن جموں صوبے کے مسلمانوں کو اس کے بعد جو بھگتنا پڑا، وہ ناقابل بیان ہے۔ اسی لیے وہ پاکستان کی جانب سے علیحدگی کی تحریکوں سے عمومی طور الگ رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان نے فوج کی گرفت زیادہ مضبوط کر دی۔ اسی وجہ سے جموں کے مسلمان علاقوں میں کشمیری مسلمانوں کی 1990 کے بعد کی تحریک ہمہ گیر اور پُرجوش نہیں رہی۔

پاکستان نے 1947 اور 1965 میں کشمیریوں کو اعتماد میں لیے بغیر مہم جوئی کی، جو نہ صرف ناکام بلکہ پاکستان کے لیے بدنامی کا باعث بنی۔ اسی طرح 1990 میں کشمیر کی اندرونی آزادی کی مہم میں پاکستانی کلاشنکوف اور غیر مقامی لوگوں کو دھکیل کر ہندوستانی فوجیوں اور مجاہدین کے بہروپ میں لٹیروں کے ہاتھوں نسل کشی کا نادانستہ طور موقع فراہم کیا جس سے دنیا میں پاکستان کا وقار مجروح اور کشمیر ایک ڈراؤنا خواب بن گیا۔ یہ عمل بھی مزاحمتی قیادت کو اعتماد میں لیے بغیر کیا گیا۔ نہ معلوم کشمیری قیادت پر اعتماد نہیں کرتے یا زبردستی قبضہ کر کے کسی عام آدمی کو اس کا کریڈٹ دینے کے روادار نہیں ہیں۔

1965 کی جنگ

دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی اس قدر بڑھ گئی کہ جنگ شروع ہوگئی۔ میں سوپور میں اپنے ایک رشتہ دار کے گھر تھا کہ ریڈیو سے اعلان نشر ہوا کہ پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان قوم سے خطاب کریں گے۔ میرے خیال کے مطابق گیارہ بجے فیلڈ مارشل صاحب نے اپنا ڈیڑھ منٹ کا خطاب شروع کیا۔ فیلڈ مارشل کے ان تاریخی جملوں نے کشمیری مسلمانوں کے لہو کو گرما کر مشتعل کر دیا کہ ''ہمارے دشمن کو پتا نہیں کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے جس کے ہر فرد کی زبان پر کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ گونج رہا ہے۔ میں اپنی فوج کو حکم دیتا ہوں کہ دشمن کی توپوں کے منہ ٹھنڈے کر

دے۔'' قوم کے جوش وجذبہ اور یکجہتی سے افواج پاکستان نے ملک کو بچایا۔

گرفتاری، شام جی اور پوشکر ناتھ کول

سوپور کا بازار بند، گلیاں سنسان، ٹی سٹال، ہوٹل، پان شاپ الغرض جہاں جہاں ریڈیو سے تقریر ہورہی تھی، لوگوں کا جم غفیر ان پر ٹوٹ پڑا۔ سڑکوں پر ٹریفک بند ہوگئی تھی لگتا تھا کہ کرفیو لگا ہے۔ تقریر کے ختم ہونے کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر کالجوں اور سکولوں کے طلبا کے علاوہ جو شخص جس حالت میں تھا اور جس کو جو میسر تھا ہاتھ میں لیے نعرۂ تکبیر پاکستان زندہ باد، ہندوستانی کتو واپس جاؤ کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں اور گلیوں میں امڈ آیا۔ لگتا تھا کہ لوگوں کا ایک سیلاب آ گیا ہے جو کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔

سوپور سے بارہ مولہ کا سفر اس زمانے میں تانگے سے کیا جاتا تھا جو تقریباً پندرہ کلومیٹر ہے لیکن کوئی سواری نہ میسر ہونے کی وجہ سے میں بارہ مولہ پیدل گیا اور لگتا ایسا تھا کہ میں کسی جلوس کا حصہ ہوں حالاں کہ میں باضابطہ دوسری منزل کے لیے عازمِ سفر تھا۔ رات بہت دیر سے بارہ مولہ پہنچا۔ اگلی صبح اپنے کالج کے طلبا کے ساتھ جلوس نکالا اور دوبارہ وہی کیفیت دہرائی گئی جو کہ گزشتہ روز تھی۔ میرے سمیت کچھ طلبا کو گرفتار کیا گیا اور اگلے روز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو اس وقت ایک کشمیری پنڈت پوشکر ناتھ کول تھا) کے پاس پیش کیا گیا ہم سب لوگوں کو جو کہ تقریباً تیس کے قریب تھے، ایک لائن میں کھڑا کیا گیا اور سب سے انفرادی طور پر پوچھ گچھ کی گئی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو بھی بلوالیا گیا تھا جو کہ اس وقت اتفاقاً میرا ارشتہ دار تھا لیکن مجھ کو جانتا نہیں تھا۔ اس کو اس کے رعب اور دبدبے کی وجہ سے ''شام جی'' کہا کرتے تھے جب کہ ان کا اصل نام سید احمد شاہ گیلانی تھا۔ اس نے ہر ایک کا نام ولدیت، سکونت کا ریکارڈ رکھنے کے علاوہ سب کو ایک ایک تھپڑ بھی رسید کیا اور ڈرا دھمکا کر فارغ کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے ایک مختصر سا لیکچر بھی دیا جو کہ مشفقانہ مشورہ تھا کہ طالب علموں کو پہلے اپنے آپ کو اس قابل بنانا چاہیے کہ اچھے برے کی تمیز کر سکیں اور لیڈرشپ سنبھالنے کے قابل ہو جائیں، اس کے بعد ملک کی تقدیر کا فیصلہ

کریں۔ یہ بات غالباً اس نے ہمارے اس فقرے کے جواب میں کہی کہ ''یہ ملک ہمارا ہے اس کا فیصلہ ہم کریں گے۔'' اس نے بہت بھلی باتیں کیں جو ہر ملک اور ہر زمانے میں انتظامیہ، لوگوں کو سلانے اور سہانے خواب دکھانے کے لیے کیا کرتی ہے۔

ڈی سی کے دفتر کے احاطے سے نکلنے کے ساتھ ہی شام جی نے ایک سپاہی کو جو سفید کپڑوں میں ملبوس تھا، میرے پیچھے بھیج دیا۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر بلوایا، وہاں مجھ سے میرے والدین اور دیگر رشتہ داروں کی تفصیل پوچھی اور خیریت دریافت کی۔ اس واقعہ کے بعد میرا شام جی کے گھر آنا جانا شروع ہوگیا اور وہ میرا بہت خیال رکھنے لگے۔ ان کے بھائی نذیر احمد شاہ جو کہ سیشن جج' مس محمودہ جو سرینگر ویمن ڈگری کالج کی پرنسپل، پھر وزیراعظم اندرا گاندھی کی ذاتی سیکریٹری بھی ہیں، کے ساتھ میرے تعلقات پہلے سے تھے۔ ان لوگوں کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ میں ان کے پسماندہ رشتہ داروں میں سے ہوں اس لیے میری بہت حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ البتہ یہ لوگ انڈین بلکہ بین الاقوامی سطح پر رابطہ کی وجہ سے اس قدر آگے نکل چکے تھے کہ اس بات کو تسلیم کرنا ممکن نہیں تھا یہ لوگ ہمارے رشتہ دار ہو سکتے ہیں۔ تاہم نذیر احمد شاہ صاحب درویش منش اور اپنی ڈگر پر ہی تھے۔ ان کے دوسرے بھائی نصیر شاہ صاحب (جو ایک ماہر ڈاکٹر تھے) نے خاندانی روایات کے خلاف ایک پنڈت خاتون گرجا دھر جو کشمیر نژاد ہندوستانی وزیر خارجہ ڈی پی دھر کی بہن تھی، سے شادی کی تھی اور غالباً دونوں اس وقت تک اپنے اپنے مذہب پر ہیں جبکہ ان کے بچے بھی اسی ڈگر پر ہیں۔ یہ تو بقول ان کے ان کا ذاتی معاملہ ہے۔

ان کی وجہ سے ہمارے پسماندہ علاقے بلکہ ہر ایک پسماندہ اور پہاڑی علاقہ کو بہت فائدہ پہنچا۔ چوں کہ ان لوگوں کا حکومت میں بے حد اثر ورسوخ تھا اس لیے سرکاری نوکریوں اور پیشہ ور کالجوں میں ہمارے علاقہ کے لوگوں کو آگے آنے کا بھرپور موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب فلاحی کاموں میں بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے اور اپنی خدمات بطور ڈاکٹر بھی لوگوں کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ اس وقت بھی اس خاندان کے لوگ سرینگر اور دہلی میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں جو اپنے لوگوں کا بہت خیال رکھتے

ہیں۔ان کے قریب ترین رشتہ دار ضلع نیلم کے تربن اور نیلم گاؤں میں آباد ہیں۔

فوجی تشدد اور فوجی رحم دلی

شام جی نے مجھے ازراہ ہمدردی مشورہ دیا کہ میں اپنے گاؤں چلا جاؤں کیوں کہ حالات زیادہ خراب ہونے والے ہیں۔ چوں کہ کالج بھی بند تھے، اس لیے میں نے مشورے پر عمل کرنے میں ہی عافیت جانی۔ ہمارے علاقے کرناہ جانے کے لیے بارہ مولہ سے دو راستے جاتے تھے، ایک بذریعہ سنگرامہ سوپور چوکی بل اور دوسرا براستہ ہندواڑہ کپواڑہ چوکی بل۔ میں بذریعہ ہندواڑہ کپواڑہ چوکی بل کے لیے بس پر سوار ہو گیا، ہندواڑہ اور اس کے آگے چوکی بل تک فوج نے تقریباً جال بچھا رکھا تھا، پلوں پر بالخصوص کڑی نگرانی تھی، ہر پل پر سواریوں کو اتار کر ان کی تلاشی لیتے تھے اور پل سے پیدل دوسری جانب جا کر بس میں سوار ہونا تھا جہاں دوبارہ تلاشی لی جاتی تھی۔

اس سفر کے دوران ہمارے ساتھ بس میں ایک بوڑھی پنڈت خاتون بھی تھی۔ جب فوجیوں نے اس کو بھی بس سے اترنے کا کہا تو اس نے اپنے ہندو ہونے کی نشاندہی کی (پرانی پنڈت خواتین کا لباس مختلف ہوا کرتا تھا)۔ مگر اس کی ایک نہ سنی گئی جب یہ خاتون بددل ہو کر اتری تو اس نے کشمیری زبان میں فوجیوں کو طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ ''ان ماں کے خصموں کو تو پکڑ نہیں سکتے، ہم پر سوار ہو جاتے ہو۔'' اس پر ساری بس کی سواریوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ فوجی حوالدار پریشان ہو گیا کہ کیا ماجرا ہے کہ لوگ پریشان ہونے کی بجائے ہنس رہے ہیں۔ اس نے ایک سواری سے ہنسنے کا سبب پوچھا تو اس کو اس عورت والی بات بتائی گئی وہ بھی ہنسا اور کہا کہ ''اماں تم ان کی ماں کے خصموں سے پوچھو جنہوں نے ہمیں اس کام پر لگایا ہے۔'' اس طرح یہ تلخی مذاق کی نذر ہو گئی۔

ہم لوگ بارہ بجے چوکی بل پہنچے جہاں سے آگے کرناہ کے لیے پیدل جانا تھا، راستے میں ایک مقام جس کا مقامی نام درنگیاڑی اور فوجی نام (Transit point (TP ہے، پہنچے تو دیکھ کر حیران ہو گئے کہ ایک برفیلے نالے میں ہمارے علاقے کے تین معزز لوگوں کو شلواریں اتروا کر پانی میں کھڑا کیا

گیا ہے۔ اس بے عزتی کا اندازہ کوئی عزت والا ہی کر سکتا ہے۔ برفانی پانی کے نالے میں کھڑا ہونے سے جو تکلیف ہوتی ہے، اس کی شدت کا اندازہ بھی وہی شخص لگا سکتا ہے کہ جس نے کبھی ایسے پانی میں ہاتھ ڈالا ہو۔ ہم لوگ میرے خیال میں 9/10 تھے جب ان کے قریب پہنچے اور دو فوجیوں کو دریا کے کنارے بندوقیں تانے اور لوگوں کو شلواریں اتارے ہوئے پانی میں کھڑا دیکھا تو ذہنی کوفت ہوئی۔ میں نے فوجیوں کے قریب ہونے سے پہلے ہی جے ہند کا نعرہ لگایا۔

ہندوستان کے ہندوؤں میں عام طور پر تین سلام مستعمل ہیں، عام اور سول شہریوں کے درمیان ''آداب عرض'' اور ''جے رام جی'' کی اور سول اور فوجیوں کے درمیان ''جے ہند'' فوجی اس بات پر بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ باقی ساتھیوں میں سے کچھ نے جے رام جی کی اور کچھ نے جے ہند کہا ہمارے ساتھ ایک ہندو دوست گردھاری لعل بھی تھا اس کو ہم نے Typical ہندوانہ طریقے سے جے رام جی کرنے کو کہا جس نے ویسا ہی کیا۔ باقی ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید میں یہی ڈراما کیا۔ فوجیوں نے ہمارا ''پاس'' چیک کیا اور جانے کی اجازت دے دی۔ پاس اس علاقے کا ایک خصوصی اجازت نامہ یا پروانہ ہے جو علاقے کے تھانے سے جاری ہوتا ہے۔ ہم نے پانی میں زیر عتاب لوگوں کی جانب کوئی توجہ نہ دی اور نہ ہی ان کو محسوس ہونے دیا کہ ہم نے ان کو دیکھا ہے کہ کہیں وہ اپنی بے عزتی نہ سمجھیں۔

جب ہم لوگ تقریباً تین کلومیٹر آگے ایم پی چیک پوسٹ پر پہنچے (جہاں دوبارہ پاس چیک ہونے تھے) وہاں پہنچ کر ان کی توجہ اس جانب دلوائی۔ ایم پی چیک پوسٹ پر عام طور پر مہذب لوگوں کو رکھا جاتا ہے جو توجہ سے بات سنتے ہیں۔ ان لوگوں نے کسی سے فون پر بات کی اور ہمارے آگے بڑھنے سے پہلے پہلے ایک فوجی جیپ کیمپ سے نکل کر چیک پوسٹ کی جانب آئی ہم سے مزید معلومات حاصل کر کے جیپ میں سوار صوبیدار اور تین سپاہی اس جانب گئے جہاں ان سفید پوش معزز لوگوں کو سزا دی جا رہی تھی۔ صوبیدار نے جیپ سے اتر کر چیک پوسٹ کے لوگوں سے کہا کہ ہمیں ان کی واپسی تک پیش قدمی سے روکا جائے۔ لہٰذا ہم وہیں بیٹھ گئے۔ دن ڈھلتا جا رہا تھا، ادھر رات کا کرفیو بھی ہونا تھا اور راستہ جنگل سے گزرتا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ جیپ ان تین معززین کو ساتھ لیے ہوئے ہمارے

قریب پہنچی۔تینوں ہم پر برس پڑے کہ ہم نے ان کی جانب توجہ نہیں دی تھی اور منہ پھیر کر نکل آئے۔ اس پر ہم نے ان کو سارا ماجرا سنایا اور صوبیدار نے بھی ان کو کہا کہ ان کا ''دھنے واد'' یعنی کہ شکریہ ادا کرو کہ انہی کے توسط سے تمہاری جان بخشی ہوئی۔

ہم نے تھوڑی سی ہمت کر کے صوبیدار کو کہا کہ اب چار بجے شام کا وقت ہے اور سات بجے تک گھپ اندھیرا ہو جائے گا جبکہ کرفیو بھی لگنا ہے اس لیے ہمارا رات کو یہیں کسی بیرک میں رہنے کا بندوبست کریں مگر اس نے کورا جواب دیا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالی جب مہربان ہوتا ہے تو اسباب خود بخود بن جاتے ہیں اسی اثنا میں Becon کی ایک گاڑی پٹرول کے کنستر لوڈ کیے ہوئے ٹنگڈار جانے کے لیے وہاں پہنچی۔ بیکن ایک نیم فوجی کمپنی ہے جو بارڈر علاقوں میں سڑکیں بنانے کا کام کرتی ہے میرے خیال میں ہماری انجینئرنگ کور یا FWO کی طرز کی کوئی کمپنی ہے۔ اس صوبیدار نے ہم سب کو اس گاڑی پر جو کہ ٹرک نما تھی، پیچھے لوڈ کیا اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ ان کو اپنے اپنے گھروں پر چھوڑنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے راستے میں تین ملٹری چیک پوسٹوں کو یہ ساری بات بھی سمجھا دی تا کہ ڈرائیور ہمیں راستے میں ہی کہیں نہ اتار دے اس طرح ہمارا چوکی بل سے گھر تک کا سفر تمام ہوا۔

یہ ایک ہی فوج کے تشدد اور رحم دلی کے دُو روپ ہیں۔

جنگ اور روزگار بذریعہ بیگار

یہ جنگ کا زمانہ تھا ابھی مکمل طور جنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔فوجوں کے درمیان گولہ باری جاری تھی اور دونوں جانب سے آگ برس رہی تھی۔ ہم تک صرف دھماکوں کی آواز آتی تھی رات کے وقت اِدھر اُدھر چلنے والے توپ کے گولوں کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ ہمارے گھر کی تیسری منزل کی ''ڈب'' یعنی برآمدہ نما چیز کے سامنے ''کافرکھن'' کی پہاڑی ہے جہاں ہندوستان اور پاکستان کی پوسٹیں آمنے سامنے ہیں۔ بٹ پورہ نامی مقام پر ہندوستانی توپ خانہ تھا جہاں سے ہر طرف توپوں کے گولے داغے جاتے تھے جس کی وجہ سے آزاد کشمیر کے علاقوں میں شنید ہے کہ کافی نقصان ہوا۔ یہ

گولے ہماری نظروں کے سامنے سے گزر کر اِدھر اُدھر جاتے تھے۔ انتہائی جان لیوا لمحات تھے لیکن جب گولے کی چمک سفر کر رہی ہوتی تھی تو بہت ہی مسحور کن لگتے تھے جیسا کہ کوئی ستارہ ٹوٹ کر گر رہا ہو یا دُم دار ستارہ فضا میں تیر رہا ہو۔ ہمارے علاقے میں پاکستانی توپ کے گولے مقامی آبادی میں نہیں گرتے تھے یا نہیں مارے جاتے تھے، اس لیے کوئی سویلین جانی نقصان پاکستان کی گولہ باری سے نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ہمارے بزرگ ہمیں بتاتے تھے کہ پاکستانیوں کے لیے بہت مشکلات ہیں کہ وہ ہم پر گولہ باری نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کو پتہ ہے کہ اس طرف ساری مسلمان آبادی ہے جبکہ ہندوستانی فوج کے لیے پاکستانی فوج اور سول آبادی ایک جیسی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی بات سچ بھی ہے۔ یوں پاکستانی فوج نے یہ انگریزی مقولہ جھوٹا ثابت کر دیا کہ

All is fair in love and War یعنی محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

ان دنوں آج کل کے مقابلے میں ہندوستانی حصے میں چند کچی سڑکیں تھیں۔ دور دراز فوجی چوکیوں پر فوجی ساز وسامان پہنچانے کا کام مزدور ہی کیا کرتے تھے۔ ہر گاؤں کے نمبردار اور چوکیدار کی ذمہ داری تھی کہ وہ مقامی تھانیدار اور تحصیلدار کی ڈیمانڈ کے مطابق نفری مہیا کریں۔ لوگ اس کو ''بیگار'' کہتے تھے کیوں کہ لوگوں کو زبردستی اگلے مورچوں تک ایمونیشن اور دیگر سامان پہنچانے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ تاہم اس کے لیے باضابطہ یومیہ اجرت دی جاتی تھی۔ اجرت کا ریٹ موسم، فوجی چوکی تک مسافت اور سامان کے وزن کے مطابق ہوتا تھا۔ اس کا تعین لیبر ڈیپارٹمنٹ کا کوئی آفیسر کرتا تھا جو آرمی اور سویلین کے درمیان لیزان کا کام کرتا تھا۔ سڑکوں کا نیٹ ورک نہ ہونے کی وجہ سے اس علاقے کے لوگوں کا یہی ذریعہ معاش تھا۔ اس کے علاوہ مقامی طور پر بھی فوجی یونٹوں میں کام لیا جاتا تھا۔ لیبر آفیسر ہی مقامی فوجی یونٹوں یا دور دراز کی چوکیوں کے لیے لیبر بھرتی کرتا تھا جس کے پاس خچر یا گھوڑا ہوتا اس کو ترجیح دی جاتی تھی، اور اس کی اجرت بھی دگنی ہوتی۔ فوجیوں کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کو باہمی ملی بھگت سے راشن، کپڑا وغیرہ بھی مل جاتا تھا جو باضابطہ اجرت کا حصہ نہ تھا، اس وجہ سے اس علاقے میں لوگ وادی کے دیگر علاقوں کے عام لوگوں کی نسبت زیادہ خوشحال تھے۔ اب

چوں کہ ہر فوجی چوکی تک سڑک پہنچا دی گئی ہے اور وہ بھی کشادہ اور پختہ، اس لیے بار برداری کا کام انسانوں یا خچروں کے ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ فوج اپنی ٹرانسپورٹ سے کرتی ہے۔

مجھے گزشتہ 5 / 6 برسوں میں مسلسل کشمیر جانے سے محسوس ہوا کہ اس علاقے کے لوگوں کو تعلیمی میدان میں ترقی کرنے کی وجہ سے پوری وادی اور وادی سے باہر نوکریاں ملی ہیں۔ فوج اور پیرا ملٹری میں تو تقریباً ہر گاؤں کے لوگ ہیں جس وجہ سے خوشحالی میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ جب سے ہندوستان نے LOC پر باڑ بندی شروع کی ہے روزگار کا ایک نیا ذریعہ کھل گیا ہے جس کے لیے مزدور، مستری، سیمنٹ، سریا، تار اور ان سے متعلقہ دیگر سامان کی ترسیل اور تنصیب پر بے شمار رقم خرچ کی جاتی ہے۔ جو کسی نہ کسی طور مقامی آبادی کی جیبوں میں جاتی ہے۔ لوگوں نے بیل اور ہل کو چھوڑ کر ٹریکٹر، لکڑی کی بجائے سلنڈر گیس، گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کی بجائے گاڑیاں رکھنا شروع کر دی ہیں۔ اس طرح پیسہ مسلسل گردش میں ہے اور کاروباری سرگرمیاں عروج پر ہیں۔

وادی کے باقی حصوں کے مقابلے میں اس علاقے میں مجاہدین کی سرگرمیاں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ علاقہ محصور ہے پانچ بریگیڈ فوج کے مقابلے میں آبادی بھی محدود ہے جس وجہ سے معاشی طور پر یہ علاقہ متاثر نہیں ہوا۔ ایک اور نفسیاتی وجہ بھی ہے کہ اس علاقے کے لوگ پیرا ملٹری فورسز میں ہیں جس کی وجہ سے وہ زیادہ محتاط ہو گئے ہیں کیوں کہ ان کا رزق اس سے وابستہ ہے لیکن اس کے باوجود اس علاقے کے لوگوں کے خلاف بداعتمادی کی فضا موجود ہے۔

مسلمہ جذبہ

جنگ کے دنوں میں اس علاقے کی کیفیت بھی ویسی ہی تھی جیسا کہا جاتا ہے کہ ''تلواریں کوفیوں کے ساتھ اور دل حضرت امام حسینؓ کے ساتھ۔'' لوگ پاکستان کی کامیابی کے لیے دعا گو اور پاکستانیوں کی شجاعت اور بہادری کے طرح طرح کے ممکن اور ناممکن قصے گھڑتے اور سناتے تھے مثلاً یہ کہ پاکستان کی توپ کا گولہ فلاں مورچے میں ہندوستانی توپ کی نالی کے منہ کے اندر لگا۔ فلاں چوکی پر

پاکستانی فوج نے اللہ اکبر کہہ کر ہلہ بولا تو چوکی میں موجود فوجی اس کی گرج 48 سے ہی دم بخود ہو کر مر گئے یا یہ کہ ہندوستانی توپوں نے گولے چلانے بند کر دیئے۔ ممکن ہے کہ کوئی بات صحیح بھی ہو لیکن اس وقت اور حالات میں سب ہی صحیح لگتی تھیں۔ اس کی وجہ فقط یہ تھی کہ ہمارے دل اور جذبات پاکستان کے ساتھ تھے اور ہمیں وہی باتیں سنائی جاتی تھیں جو ہم سننا چاہتے تھے۔

جب عالمی دباؤ کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بند ہوئی تو مجھے ٹنگڈار بریگیڈ میں کام کرنے والے ایک مزدور نے کہا کہ ''اگر جنگ دو گھنٹے اور بند نہ ہوتی تو پورا بریگیڈ خالی ہو جانا تھا کیوں کہ فوجیوں کو بریگیڈ خالی کرنے کا حکم ملا تھا۔'' جنگ بندی کے بعد پاکستانی صدر فیلڈ مارشل ایوب خان اور ہندوستانی وزیر اعظم لعل بہادر شاستری کی تاشقند' روس میں ملاقات ہوئی جہاں 10 فروری 1966 کو تاشقند معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اسی رات ہندوستانی وزیر اعظم کا تاشقند میں انتقال ہو گیا۔ یار لوگوں نے اڑائی کہ چھوٹے قد والا ہندوستانی وزیر اعظم پاکستان کے دیو قامت صدر کی ہیبت برداشت نہ کر سکا جس وجہ سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

اس معاہدے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو مرحوم جو اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے، نے صدر ایوب مرحوم سے راہیں جدا کر لیں۔

جنگ بندی کے بعد

جنگ بندی کے بعد وادی کے اندر موجود مجاہدین کی سرگرمیاں بھی محدود ہو گئیں بلکہ یوں کہا جائے تو بجا ہو گا کہ ختم ہو گئیں۔ سنا گیا کہ ان لوگوں کو واپسی کا حکم دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر درج کیا گیا ہے کہ وہاں کی لوکل لیڈر شپ (خواہ وہ قومی دھارے میں تھے یا نہیں) کو اس بارے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا اس لیے یہ ساری سرگرمیاں بلکہ مہم عبث ثابت ہوئی۔ اکثر لوگ بلاوجہ مارے گئے بالخصوص جموں صوبے میں سرحدی علاقے کی مسلمان آبادی کا بہت نقصان ہوا۔

مجھے آزاد کشمیر آ کر لوگوں نے کہا کہ 1965 میں کشمیریوں نے مجاہدین کو پکڑوا کر مروایا۔

میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کیوں کہ جب وہاں کے لوگوں کو اعتماد میں ہی نہیں لیا گیا تھا تو وہ یہ کیسے باور کرتے کہ یہ مجاہدین تھے۔ دونوں طرف ایک ہی شکل وصورت بود و باش اور زبان ولباس کے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں کیا تمیز برتی جاتی کہ کون مجاہد ہے؟ اس حقیقت کا ثبوت 1990 کی دہائی میں ہونے والی تحریک سے ملتا ہے۔ جب تحریک مکمل طور پر مقامی تھی، مقامی لیڈر شپ اس کو کنٹرول کر رہی تھی اور مقامی لوگ ہی شامل بھی تھے جو سیاسی اور عسکری دونوں محاذوں پر کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے لیکن اس میں کمزوری صرف اس لیے آئی کہ اس کی لیڈر شپ میں اختلاف ڈلوا کر تقسیم کر دیا گیا۔

تاشقند جنگ بندی کے باقاعدہ معاہدے سے پہلے ہی جنگ بندی اور معمول کی زندگی بھی بحال ہوگئی تھی۔ ہمارے کالج اور سکول کھل گئے تھے۔ کالج میں واضح طور پر ایک تقسیم نظر آ رہی تھی ہندو اور سکھ' مسلمان دوستوں کو اس بات کا احساس دلاتے تھے کہ یہ دراندازی پاکستان نے کروائی تھی لیکن لوکل آبادی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ تاہم 1965 کی باقاعدہ جنگ پاکستان نے انتہائی جوانمردی بہادری اور قوت ایمانی سے لڑی اور ملک کا بھرپور دفاع کیا۔ اس لیے محاذوں پر پاکستانی فتوحات اور بہادری کے قصے ہماری حوصلہ افزائی کا باعث تھے بالخصوص لاہور کے محاذ پر پاکستانی قوم کی یکجہتی باعث تحسین رہی۔ فوج اور عام لوگوں میں نہ تو کوئی تفریق تھی اور نہ ہی دوری، اس لیے پوری قوم ہی فوج تھی۔ اس یکجہتی نے کشمیر کے مسلمانوں کے حوصلے بھی بلند کیے۔ اس زمانے میں ملکہ ترنم نور جہاں کے گائے ہوئے جنگی ترانے ''جنگ کھیڈنیں اے زنانیاں دی'' اور ''اے مردِ مجاہد جاگ ذرا'' نوجوانوں کی زبانوں کی آواز اور وظیفہ بن چکے تھے۔ گو کہ 1965 جنگ میں پاکستان کی فتح جتلائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں فوج نے پاکستانی سرزمین کا دفاع کیا فتوحات کوئی نہیں ہوئیں، سوائے کشمیر کے محاذ پر چھمب جوڑیاں میں کچھ علاقے ادھر ادھر ہوئے۔ ایک دفعہ شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ کشمیر لینے کی بس پاکستان سے 1961 میں مکمل طور چھوٹ گئی ہے، جب ہندوستان چین کے نرغے میں تھا، اس کے بعد رہے سہے پاکستان کی قیمت پر مہم جوئی ہو رہی ہے۔

سی آر پی میں بھرتی

اس عرصے میں نیفا کے محاذ پر بھی ہندوستان کو بہت مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ پیرا ملٹری فورسز بالخصوص بارڈر سکیورٹی فورس (BSF) اور سینٹرل ریزرو پولیس (CRPF) میں بھرتیاں ہو رہی تھیں۔ ہمارے کالج میں بھی اس سلسلے میں اہتمام کیا گیا تھا اور خصوصی ٹیمیں کالج بھی آئی تھیں بھرتی دو لیولز پر ہوتی تھیں۔ ایک آفیسر اور دوسرا سپاہی ریکروٹ، آفیسرز میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور اسسٹنٹ سب انسپکٹرز اور انسپکٹرز تک جن کے لیے الگ الگ بورڈ تھا۔ میں نے بھی بہت سے سکھ لڑکوں کے ساتھ ڈی ایس پی اور انسپکٹر کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ بھرتی کرنے والے CRPF کے ڈی آئی جی نے مجھے فوری طور پر مژدہ سنایا کہ میں ڈی ایس پی کے لیے مکمل طور پر اہل ہوں، منظوری کے بعد احکامات جاری ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں کالج میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ نئے بھرتی ہونے والوں کو نیفا اور میوزورم بھیجا جائے گا۔ وہاں چوں کہ مقامی طور پر گھمسان کا رن جاری تھا اور صبح شام لوگوں کے مرنے کی خبریں آ رہی تھیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں نے CRPF میں نہیں جانا۔ ایک سکھ دوست بلونت سنگھ کی مشاورت پر یہ بات میں نے اس ڈی آئی جی کو لکھ کر بھیجی۔ اس Batch کے بھرتی ہونے والے ایک سکھ دوست کا 1984 میں بارہ مولہ جانے پر مجھے پتہ چلا کہ وہ ڈی جی CRPF ترقیاب ہو گیا ہے۔

کالج کے پروفیسر اور طالب علم

کالج کا زمانہ جوانی کے عالم میں دیکھنا نصیب ہوتا ہے اس میں مستی اور شوخی ہوتی ہے۔ اگر استاد کامل میسر نہ ہو اور منزل کا واضح تعین نہ ہو تو انسان اس عمر میں متاع زیست سے محروم ہو جاتا ہے۔ کالج میں سکولوں کی طرح استاد نہ تو مار سکتے ہیں اور نہ ہی یہ مار کوئی ہضم کر سکتا ہے۔ اس لیے استاد بھی دوستانہ ماحول پیدا کر کے تربیت کرتے ہیں۔ استاد کو طلبا کی سطح پر آ کر ان کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے پڑھانا پڑتا ہے۔ کلاس میں موجود ہر طالبعلم کی ذہنی استطاعت کے مطابق اس سے برتاؤ کرنا پڑتا

ہے۔ میرے کالج کے چار سالہ دور میں کالج کے تمام طلبا کا پسندیدہ ترین استاد عبدالغنی بٹ تھے جو فارسی پڑھاتے تھے۔ وہ اہلیت و قابلیت کے علاوہ بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے مالک اور فنون لطیفہ کے الفاظ میں عمدہ فنکار تھے۔ ان کے علاوہ سیف الدین سوز جو اکنامکس پڑھاتے تھے' رتن لعل رینہ جو انگریزی' اور شوکت میر جو کیمسٹری پڑھاتے تھے لڑکے لڑکیوں کی توجہ کا مرکز ہوا کرتے تھے۔ یہ سارے لوگ خوش لباس' خوش گفتار اور لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بے پناہ دوستانہ تھے لیکن اس کے باوجود حدادب ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ ایک ہندو پروفیسر درابو تھے جو غالباً باٹنی پڑھاتے تھے کالج کے ہر دل عزیز پروفیسرز کی گلیکسی میں شامل تھے۔ کالج کے پرنسپل شام لعل سادھو گو کہ چالیس سال کے پینڈے میں تھے لیکن ان کے پدرانہ طرزِ عمل نے ہر ایک پر ایک محبت بھرا رعب طاری کیا تھا۔ موصوف انگریزی لٹریچر کے ماہر ترین استاد تھے اور سینٹ جوزف کالج سے گورنمنٹ ڈگری کالج میں تبدیل ہونے پر یہ پہلے پرنسپل تھے انہوں نے یہ منصب انتہائی بردباری سے نبھایا۔ آج کل اپنی بیٹی ارملا کے ساتھ ملائیشیا میں مقیم ہیں۔ ہمارے کالج کے دور میں ہم سے سینئرز میں سے اہلیت قابلیت کے اعتبار سے مظفر احمد بیگ کی پوزیشن نمایاں تھی جو ہندوستان میں ایک چوٹی کے وکیل اور مقبوضہ کشمیر کی سیاست میں ماہر اقتصادیات کے طور نائب وزیر اعلیٰ اور وزیر خزانہ رہے ہیں۔ عام طور پر مشاہدہ میں آیا ہے کہ اکثر ذہین لوگوں پر وفاداریاں بدلنے کا الزام لگا رہتا ہے یہی الزام بیگ صاحب پر بھی تھا اور انہوں نے دوست اور پارٹیاں بدلنے میں ریکارڈ قائم کیا لیکن میری ذاتی رائے میں ذہین شخص کے وفاداری بدلنے والا الزام درست نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ذہین آدمی ترقی پسند، ارتقا پذیر اور دُور بیں ہوتا ہے۔ جس وجہ سے بہتر سے بہترین کی تلاش میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور جہاں ترقی پسندی کی کوئی صورت نظر آتی ہے وہاں اچھل جاتا ہے۔ یہی حال بیگ صاحب کا تھا۔

ان کے ایک قریبی ساتھی غلام حسن لون (جو بیگ صاحب کی مالی معاونت بھی کرتے تھے) شرارت اور جرأت کے پیکر تھے۔ وہ ایک فارسٹ لیسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ انتہائی مشفقانہ رویہ تھا، لڑائی مول لینے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ تاہم عداوت نہیں رکھتے تھے۔ سال

2004 میں کشمیر جانے پر میری ان سے ملاقات ہوئی دیکھ کر افسوس ہوا کہ شوگر کے مرض کی وجہ سے وہ بینائی سے محروم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے ایک بار کالج میں کسی مجلس میں کہا تھا کہ ''جو مسلمان پاکستانی نہیں ہے، وہ اپنے باپ کی نسل سے نہیں ہے۔'' اس پر میں نے اس کو کہا کہ ''جو پاکستان نہ جا سکا اور نہ پاکستان بنا سکا، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔'' اس نے جواب دیا کہ ''وہ دلاور میر ہے۔''

دلاور میرے کلاس فیلو اور جگری دوست ہیں اور ہم لوگ کالج کی پہلی کلاس سے وکالت کے چھے سال تک تقریباً ایک ہی گھر میں رہے۔ یہی مجھے غلام حسن لون صاحب کے گھر بارہ مولہ لے گئے تھے۔ موصوف سیاسی جوڑ توڑ کے ماہر اور پارٹیاں بدلنے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ تقریباً بیس برس سے کشمیر اسمبلی کے ممبر اور منسٹر چلے رہے۔ 2014 کے اسمبلی الیکشن میں ان کا بیٹا خاور اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا کیوں کہ انہیں ایک مقامی عدالت نے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دیا تھا۔ ہمارے دوستوں کے گروپ میں عبدالمجید وٹالی جو اب سرینگر میں وکیل ہیں، غلام احمد گنائی جو شاید ڈپٹی کمشنر یا کمشنر ریٹائرڈ ہو گئے ہیں، اشوک کمار جو کسی محکمہ میں ملازم تھے اور تحریک کے بعد جموں منتقل ہو گئے ہیں، محمد رمضان گنائی، محمد رجب صوفی، بھوشن لعل اوتار کرکشن' جو سب کے سب مختلف مضامین کے ماہر پروفیسرز ہیں۔ لڑکیوں میں سے فہمیدہ' رشیدہ جو ہماری محلے دار تھیں' میمونہ' حسینہ' سلکھنی کور اور ارملا سادھو (Star of College) ہمارے گروپ کی روح رواں تھیں۔

مخلوط تعلیم کا تجربہ پہلی بار ہمیں کالج میں ہوا۔ جنس مخالف کی ایک دوسرے کے ساتھ کشش ایک فطری عمل ہے لیکن ہم میں سے ہر ایک نے دوسری جنس کا احترام کیا اور حد فاصل عبور نہیں کی۔ حالاں کہ ہم لوگوں کی بے تکلفی بدنامی کی حد تک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ہم لوگوں کا آپس میں تعلق قائم ہے بلکہ فیملیز کی حد تک تعلقات وسیع ہو گئے ہیں۔ ہماری بیویاں اور ان خواتین کے شوہر بھی اس بات کا ادراک رکھتے ہیں۔ وہ لوگ بھی اسی لیول پر تعلق نبھاتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تعلقات پر خلوص اور حدود میں رہیں اور ایک دوسرے کے حفظ مراتب کا خیال رکھا

جائے تو زندگی بھر قائم رہتے ہیں اور یہی ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

کالج دور کے پڑھائی لکھائی میں بہت اچھے، لیکن شرارتوں میں یکتا، اور بدنامی کی حد تک مشہور، غلام محمد صفی جن کو ہم لوگ عرف عام میں ''مام صوفی'' کہتے تھے، محمد اشرف صراف اور علی محمد جان تھے۔ کالج اور شہر کی ہر سرگرمی کے پس پشت ان کا ہاتھ ثابت ہوتا تھا۔ اوّل لذکر دونوں بعد ازاں پروفیسر ہو کر جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے تحریک کشمیر میں شامل ہو گئے اور ریاست کے دونوں حصوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ دونوں حضرات پاکستان میں مقیم ہیں۔ غلام محمد صفی کا نام اس زمانے میں غلام محمد صوفی تھا۔ ''صوفی'' اب زبان میں ارتقائی عمل کی وجہ سے صفی لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی بالکل ویسی ہی ہے جیسی بٹ کے تلفظ اور املا میں آئی ہے۔ بٹ اب بھٹ لکھا اور بولا جاتا ہے۔

غلام محمد صفی بہت شرارتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز کالج کی ایک لڑکی کا برقع اوڑھ کر لڑکیوں کے کیبن میں گھس گئے۔ پرنسپل کی بیٹی یا راحت نامی ایک لڑکی جو دراز قد اور انتہائی خوبصورت تھی، کو شک گزرا۔ اس کی شکایت پر کالج کا ماحول بہت تلخ ہو گیا لیکن پروفیسر غنی بٹ صاحب کی فہم و فراست سے یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو کر رفع دفع ہو گیا۔

1991 یا 1992 کی بات ہے جب یہ لوگ پاکستان آئے، اسلام آباد ہوٹل میں غالباً (عبدالصمد وانی صاحب مرحوم) کے بیٹے کی شادی میں ہم لوگ شریک تھے تو یہ دونوں حضرات مجھے گلے ملے۔ اس پر چوہدری عبدالعزیز جو اس وقت مرحوم سردار عبدالقیوم صاحب کی حکومت میں وزیر تھے، نے مجھ سے پوچھا کہ ''یہ کون لوگ ہیں؟'' میں نے ان کا تعارف کروایا اور ان کے کالج کے زمانے کی شوخیاں بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب ان میں کس قدر تبدیلی آئی ہے کہ جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے ہیں، اس پر چوہدری صاحب نے برجستہ کہا کہ، اس پس منظر کے ساتھ تو اب ہی یہ صحیح جگہ پر آ گئے ہیں۔ اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

کالج کے زمانے سے لے کر آج تک میرے ذاتی اور گھریلو تعلقات عبدالمجید وٹالی، دلاور

48

میر، غلام احمد گنائی، فہمیدہ اور اشوک کمار کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا اس زمانے سے چلا آ رہا ہے جبکہ اب ہم سب لوگ دادا نانا بھی بن گئے ہیں لیکن دوستی اور تعلقات کا معیار وہی ہے۔ مجید وٹالی کے والد مرحوم غلام نبی جن کو حاجی صاحب کہتے تھے اور ان کے بھائی علی محمد وٹالی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔

اشوک کمار کے گھر ہم لوگ ان کے تہوار شیوراتری پر ان کی ماں کے ہاتھ سے اس دن کی خصوصی ڈش مچھلی بہت شوق سے کھاتے تھے۔ وہ بھی ہمارے لیے مچھلی بڑے اہتمام سے تیار کر کے رکھتی تھیں۔ اشوک اور اوتار کرشن، ہمیں، بلکہ زیادہ تر مجھے ہی ایک مندر، جس کو دیوی بل کہتے ہیں جو بارہ مولہ قصبے 'اور خانہ پورہ محلہ کے درمیان ہے، لے جایا کرتے تھے جہاں ہم لوگ مچھلی پکڑا کرتے تھے۔ یہ مندر دریائے جہلم پر واقع ہے اور اس سے متصل دریا میں بڑی بڑی مچھلیاں دریا کی سطح پر تیرتی رہتی تھیں کیوں کہ ہندو لوگ بچا کھچا اور دھان کیا ہوا کھانا اور پرشاد یہاں پر دریا کی نذر کرتے تھے جس کو کھانے کے لیے یہ مچھلیاں سطح آب پر ہی رہتی تھیں۔ اب اس مندر کا نام فوج نے بدل دیا ہے اور فوج کی تحویل میں ہے۔

کالج کا وہ سنہرا زمانہ تھا جس کے دوست زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوئے۔ اگرچہ آج ہم دنیا کے مختلف علاقوں میں زندگی گزار رہے ہیں مگر جب بھی ملتے ہیں تو پرانے دن لوٹ آتے ہیں۔ وہ باتیں، وہ یادیں خوشبو کے جیسی ہیں جو ذہن و دل کو مہکا دیتی ہیں۔ میں اکثر ان لمحات میں جب یہ یادیں میرا احاطہ کیے ہوتی ہیں، صفی لکھنوی کا شعر گنگناتا ہوں۔

ے ہوتا تو نہیں ایسے مگر ہم نے کیا ہے
ایک یادِ مسلسل پہ لگاتار گزارا

ؔ غزل اس نے چھیڑی ہے مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

شیری پروجیکٹ

ہمارے کالج کے غالباً آخری سال 68-1967 میں ہندوستان نے دریائے جہلم پر ایک ہائیڈل پاور پراجیکٹ بنایا جس کو شیری پروجیکٹ کہتے ہیں جو غالباً 350 میگاواٹ کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک گاؤں پہلی پورہ کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں پرانے ضلع مظفرآباد اور اب ضلع بارہ مولہ کا مشہور راجگان خاندان آباد ہے، یہاں پر ہمارے علاقے کے دو بھائیوں ملک امان اور ملک زمان نے شادی کی تھی، ان کے ساتھ ہماری رشتہ داریاں بھی ہیں، جن کے پاس میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ میں نے ان کی ذمہ داری لگا رکھی تھی کہ جس دن پاور پراجیکٹ کو چلانے کی خاطر جہلم کے پانی کو موڑ کر اس نہر میں ڈالا جائے گا، مجھے ضرور اطلاع دیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اس کی اطلاع دی کہ اگلے روز یہ ہونا ہے۔ میں اپنے محلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ تماشا دیکھنے چلا گیا۔ دریا کا رخ نہر کی جانب مڑنا تھا کہ دریائے جہلم کے زیریں حصے میں قدآدم مچھلیاں تڑپنے لگیں۔ یہاں مجھے ماہی بے آب والے محاورے کی پہلی بار سمجھ آئی۔ ہم لوگوں نے اپنی اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق مچھلیاں پکڑیں اور گھر لے آئے چوں کہ ٹرانسپورٹ کا اور ان کو محفوظ رکھنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا کیوں کہ اس زمانے میں فریج وغیرہ نہیں ہوتے تھے، اس لیے میں نے وہ مچھلیاں پورے محلے میں بانٹ دیں۔ یہ نظارہ میں اکثر یاد کر کے قدرت کی کارسازیوں کی داد دیتا ہوں کہ اس نے پانی میں کیا طاقت رکھی ہے، اس کو استعمال میں لانے والوں کی تو بات ہی نہیں۔ زندگی کی بنیاد، خوراک پیدا کرنے کی اکائی، توانائی پیدا کرنے کا ذریعہ، آبی حیات کے ذریعہ رزق اور روزگار کا وسیلہ، اور نہ جانے کیا کیا۔

ہندوستان نے دریائے جہلم پر تین پاور پراجیکٹ بنائے ہیں جبکہ ہم یہ سارا پانی ضائع کر رہے ہیں جو سات ہزار فٹ سے دو ہزار فٹ تک کے لیول تک آ جاتا ہے۔ نہ صرف یہ، بلکہ دریائے نیلم جو دس ہزار فٹ سے دو ہزار فٹ کے لیول پر آ رہا ہے، اس کو بھی ضائع کر رہے ہیں اور بات ایشین ٹائیگر بننے کی کرتے ہیں۔ ٹائیگر صرف وہی بن سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کو سمجھیں اور اس نعمت کو استعمال میں لائیں جن کی اللہ تعالیٰ نے ہم کو دعوت دی ہے۔ اب نیلم جہلم اور کوہالہ ہائیڈرل پروجیکٹ

کے لیے مظفرآباد شہر سے گزرنے والے دریائے نیلم اور دریائے جہلم کا رخ موڑا جا رہا ہے جس سے مظفرآباد شہر ویرانی اور آلودگی کا شکار ہو جائے گا جس کے تدارک کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا۔

(سخر الکم مافی سمٰوٰت و مافی الارض و مافی بینھا)۔

یہ دعوت بنی نوع انسان کے لیے ہے جس میں کسی مسلم یا غیر مسلم کی قید نہیں ہے بلکہ جس نے اس پر عمل کیا وہ فلاح پا گیا اور اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اس کی خوشنودی کے لیے کیا تو پھر نوراً علیٰ نور۔ مستقبل اسی قوم کا ہے جس کے پاس انرجی ہے اور انرجی کا سستا ترین اور آسان ترین ذریعہ پانی ہے۔ مجھے پاکستان کے بھارت پر لگائے گئے اس الزام پر ہنسی آتی ہے کہ ہندوستان' پاکستانی دریاؤں کا پانی روک رہا ہے۔ جب پاکستان خود اس کو ضائع کر رہا ہے تو ہندوستان کو استعمال کرنے میں کس طرح اعتراض کرتا ہے؟ ہندوستان کے بنے ہوئے ڈیم ہم لوگ ختم یا بند کروانے سے تو رہے، اب کوئی ایسی صورتِ حال کی جانچ کرنی چاہیے کہ دونوں ملک بنے ہوئے ڈیمز سے استفادہ کریں اور بھارت مزید ڈیم نہ بنائے۔ جس سے پاکستان کے حصے میں آنے والا پانی متاثر ہو۔

ایوب خان نے پاکستان میں انڈسٹری بیس بنانے میں اہم کام کیا لیکن تین دریا ہندوستان کو فروخت کر کے اور باقی تین میں پانی کے استعمال کا حق دے کر ہندوستان کو آبی دہشت گردی کا موقع فراہم کیا ہے۔ بہ ایں ہمہ اگر سندھ طاس معاہدہ نہ ہوا ہوتا تو ہندوستان سارے دریاؤں کا رخ موڑنے میں حق بجانب ہوتا۔ ہندوستان کی سپریم کورٹ نے حکومت ہند کو حکم دیا کہ 2050 تک تمام دریاؤں کو اکٹھا کر کے پورے ہندوستان میں نہروں کا جال بچھا دیں۔ چناب، جہلم اور سندھ کا رخ موڑنا تو بظاہر ناممکن ہے، لیکن ان پر Storage سے پاکستان کو نقصان ضرور پہنچایا جا سکتا ہے، اس کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔